
نوید ملک

نوید ملک



Email Address: naveed_poet82@yahoo.com

Face book page: www.facebook.com/naveedmalikpoetry

YouTube Channel: Poetry Naveed Malik

انتساب

اپنے والدین مرحومین کے نام

جن سے ایک دن اللہ کی رحمتوں کے سائے تلے

ملاقات ہو گی

آراء

جدید غزلوں میں نئی زمینوں اور ردیفوں کے ساتھ ساتھ مختلف قسم کی بحروں کا استعمال اب ایک فیشن کی سی شکل اختیار کر گیا ہے۔بلاشبہ کچھ ایسے اور غیر معمولی صلاحیت کے حامل نوجوان شعرا نے اس حوالے سے بہت عمدہ اور یاد رہ جانے والے اشعار بھی کہے ہیں لیکن زیادہ تر نے ہنر سے صرف چونکا دینے کا کام لیا ہے جو ایک خطرناک راستہ ہے کہ اس میں خالص فن اور شعبدہ بازی ساتھ ساتھ چلنا شروع کر دیتے ہیں۔نوید ملک کے اس شعری مجموعے کی سب سے پہلی اور نمایاں خوبی تو یہی ہے کہ اُس کی تقریباہر غزل میں جدت پسندی کے باوجود اچھے اور یاد رہ جانے والے اشعار جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔اُس نے الفاظ کے مروجہ علمی اور استعاراتی معانی میں پوری مہارت اور کامیابی سے نئے اور اضافی پہلو دریافت کیے ہیں اور یوں صرف قاری کو چونکایا ہی نہیں بلکہ اپنے ساتھ رہنے اور چلنے پر آمادہ بھی کیا ہے۔میرے خیال میں ان کا شمار جدید غزل کے ان منتخب شعرا میں ہوتا ہے جن میں وہ تمام امکانات اور آثار موجود ہیں جو انھیں بہت آگے تک لے جاسکتے ہیں۔مجھے یقین ہے کہ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد آپ بھی ہماری طرح اس رائے سے اتفاق کریں گے

امجد اسلام امجد

آج کے دور میں کامیاب شاعر وہ ہے جس کی نگاہیں معاشرے کی تمام سچائیوں کو دیکھ سکیں اور وہ انھیں محسوس کرکے شعر میں ڈھال سکے۔

جب سے یہ ہوئی سب کو خبر دیکھ رہا ہوں

چہروں پہ ابھرتے ہوئے ڈر دیکھ رہا ہوں

اس شعر کا خالق نوید ملک اس معیار پر پورا اترتا ہے۔نوید ملک کا کچھ کلام نظر سے گزرا تو محسوس ہوا کہ نوید ملک نے اپنے خونِ دل کو اپنے اشعار میں شامل کرکے ایک اچھا شاعر ہونے کی سند حاصل کرلی ہے۔

آفتاب قمر زیدی

حلقہ اربابِ ذوق / نیوجرسی امریکہ

میں نوید کو نئ علامتوں کا شاعر لکھوں کیونکہ نوید کے جو اشعار مجھ تک پہنچے ہیں ان میں عصریت کے تقاضوں کا خاصہ حوالہ ہے ،تاروں کا اٹھانا،دنیا کا اگانا،لہروں کا دائرہ،شعور کا سمندر ہونا،ہر سمت بھنور کا ہونا،پرندوں کا غلیل سے نہ ڈرنا،کچے مکانوں اور کنوؤں کا نہ بچنا،وغیرہ جیسی علامتوں کا کینوس اس قدر وسیع ہے کہ تفصیل کے لئے کئ اوراق سیاہ کرنے ہوں گے،اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اردو اور ہندی دونوں کو وہ خود سے الگ نہیں کر پائے ،اس کی بہت سی مثالیں ہندوپاک کے شعرا کے ہاں پائی جاتی ہیں۔

قمر بدر پوری / نئ دہلی انڈیا

شعری اثاثے

غزلیہ مجموعہ (اک سفر اندھیرے میں)2011

نظمیہ مجموعہ (کامنی) 2013

طویل نظم (منقوش) 2019

حمد

ہلا کے سر جو کہا ایک بار، اللہ ہو
صدائیں آنے لگیں بے شمار، اللہ ہو

بس اُس کی ذات میں گم ہو کے ذکر جاری رکھ
جو ہوش آئے تو پھر سے پکار، اللہ ہو

مٹا دے ذہن سے سارے خیال دنیا کے
پھر اس کے بعد بدن میں اُتار، اللہ ہو

گناہ سارے بس اک پل میں اس کے دھل جائیں
جو شخص ہو کے کہے اشک بار، اللہ ہو

نگاہ پڑتی ہے میری جب ان مناظر پر
زباں پہ آتا ہے بے اختیار، اللہ ہو

نعت

وہ آئے آمنہؓ بی بی کے گھر چراغ جلے
اجالے مٹنے لگے تھے مگر چراغ جلے

صنم کدوں کے اندھیروں نے جب زمیں جکڑی
پکارنے لگے سارے حجر، چراغ جلے

وہ آ گئے کہ یہ دنیا سجی ہے جس کے لیے
جہاں جہاں بھی یہ پہنچی خبر چراغ جلے

وہ دشت کیسا تھا جس پر فلک کی نظریں تھیں
وہ کیسا حجرہ تھا جس میں نڈر چراغ جلے

یہاں ستارے چمکنے سے پہلے ڈرتے ہیں
وہ شہر ہوگا نبی ﷺ کا اگر چراغ جلے

درود پڑھتے ہوئے دیکھتی تھی مجھ کو ماں
درونِ ذات مرے عمر بھر چراغ جلے

بہت طویل ہے اک داستاں اجالوں کی
بتائے دیتا ہوں میں مختصر چراغ جلے

مرے نبی ﷺ کے لیے جو بھی جھلملائے تھے
زمانے بھر میں وہی معتبر چراغ جلے

وگرنہ سینے میں دل تیرگی بجھائے گا
کرو مدینے کا تم بھی سفر، چراغ جلے

زمیں پہ آج بھی جنگِ یمامہ جاری ہے
ہر ایک گام ہَوا، ہر نگر چراغ جلے

تو کیا تمہاری بصارت پہ "بدر" چمکا نہیں
تو کیا تمہیں نہیں آیا نظر چراغ جلے

ہر اک ستارے سے اُجلے کئی ستارے نوید
ہر اک چراغ کے زیرِ اثر چراغ جلے

سلام بحضور امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ

سودا کیا جو عشق میں، ستا نہیں کیا
گھر بار لُٹ گیا تو، تقاضا نہیں کیا

ہر سمت یہ اجالے، بہتّر کے دم سے ہیں
یعنی کسی چراغ نے رُسوا نہیں کیا

کوفے کے بعد ایسی ہوا دل میں چل پڑی
ہم نے کسی بھی خط پہ بھروسا نہیں کیا

وہ کربلا کی دھوپ، وہ پیاسی زمیں کا شور
وہ قافلہ کہ ایک بھی شکوہ نہیں کیا

اے جبر! کیوں حسینؓ پہ برسا تو بار بار
اُس پر تری مجال، کہ پردہ نہیں کیا

غزل

ہر دِیارات کے چھانے سے بڑا ہوتا ہے
دل تو نقصان اٹھانے سے بڑا ہوتا ہے

اذن ہوتا ہے مدینے سے جسے لکھنے کا
وہ قلم سارے زمانے سے بڑا ہوتا ہے

میرے اشکوں نے بھی دیکھا ہے یہ منظر اِک شب
آسماں ہاتھ بچھانے سے بڑا ہوتا ہے

پھول ماحول بنائیں تو زمانہ دیکھے
باغ خوشبو میں نہانے سے بڑا ہوتا ہے

تم نے دیکھا تھا بڑی چاہ سے اِک بار جسے
چاند اُس جھیل میں آنے سے بڑا ہوتا ہے

ننھے کاندھوں پہ کتابوں کا نہ یوں بوجھ بڑھا
بستہ خوابوں کو جگانے سے بڑا ہوتا ہے

کوئی خوبی نہیں مجھ میں، یہ خدا کا ہے کرم
سینہ دشمن کو منانے سے بڑا ہوتا ہے

عشق میں کھُل کے جنوں اپنا لٹاؤ تم بھی
ایسا تہوار منانے سے بڑا ہوتا ہے

میرے بیٹے نے کہاڈر کے سمندر سے آج
یہ تو دریاؤں کو کھانے سے بڑاہو تا ہے

اتنے لوگوں میں چھپاؤنہ محبت میری
دوست !طوفان تو آنے سے بڑاہو تا ہے

آپ جو بات بھی کرتے ہیں لگے دل کو بھلی
آپ کا تیر نشانے سے بڑاہو تا ہے

ایک چہرے پہ کئی اور ہیں چہرے جب سے
ہر نیاقہر، پرانے سے بڑاہو تا ہے

ایک احساس ہے جو مجھ کو گھٹائے ہر دن
آئنہ مجھ کو رلانے سے بڑاہو تا ہے

بیٹیاں سب کی نگاہوں میں ہیں تاروں جیسی
یہ جو بیٹا ہے، کمانے سے بڑاہو تا ہے

مجھے لگتا ہے اُسے ماں نے دعائیں دی ہیں
جس کا ہر لفظ خزانے سے بڑاہو تا ہے

معتبر شخص بھلاتا نہیں محسن اپنا
اور استاد سکھانے سے بڑاہو تا ہے

وہ مقدّر کو لکھا جان کے چُپ رہتا تھا
میں یہ کہتا تھا بنانے سے بڑا ہوتا ہے

اِس کٹاؤ میں تعلق کی حفاظت بھی تو ہو
یار! پودا تو بچانے سے بڑا ہوتا ہے

درد ہونٹوں پہ امڈ آئے گا اک دن تیرے
زخم سینے میں چھپانے سے بڑا ہوتا ہے

کس لیے قید میں اِک خواب کو رکھے ہوئے ہو
یہ پرندہ تو اڑانے سے بڑا ہوتا ہے

اِس نگر میں ہمیں حالات عجب ہیں درپیش
مسئلہ شور گھٹانے سے بڑا ہوتا ہے

کوفے والوں کو سمجھ آئے بھلا کیسے یہ بات
گھر تو گھر بار لٹانے سے بڑا ہوتا ہے

سچ تو ہے پھر بھی میں بیٹے کو بتاؤں کیسے
چودھری "پنڈ" کا تھانے سے بڑا ہوتا ہے

پہلے پہلے بڑے لوگوں سے بڑا ہوتا تھا
گاؤں اب میلہ سجانے سے بڑا ہوتا ہے

آؤمل کر اُسی جھگڑے پہ انڈیلیں پانی
وہ جو ہر بار جلانے سے بڑا ہوتا ہے

جو پرندوں کی اڑانوں پہ کرے حشر بپا
گھونسلہ ایسے ٹھکانے سے بڑا ہوتا ہے

لوگ ایسے بھی ہیں درویش جنھیں علم نہیں
آدمی ہاتھ ملانے سے بڑا ہوتا ہے

دھوپ میں جلنا ہی کافی نہیں اے دوست! شجر
اپنی شاخوں کو جھکانے سے بڑا ہوتا ہے

یوں کسی کرب کی پرتیں نہ دکھا لوگوں کو
غم بھی دریا ہے، بہانے سے بڑا ہوتا ہے

زیست وہ دشت ہے جو لُو کے بکھرنے کے بعد
تشنگی اپنی بڑھانے سے بڑا ہوتا ہے

دائرہ فکر و تدبّر کا، نگاہوں کا نوید
کسی نقطے پہ گھمانے سے بڑا ہوتا ہے

غزل

کسی فقیر، کسی "پیر" سے بہت پہلے
میں اک صحیفہ تھا تفسیر سے بہت پہلے

حرا کے طاق پہ تاروں نے سجدے بوئے تھے
ہر اِک چراغ کی تنویر سے بہت پہلے

کٹھن تھا وقت وہ کتنا تماش بینوں پر
پرند، دھند، شجر، تیر سے بہت پہلے

بس اِک سوال پہ اُکسائے کائنات مجھے
وہ کیا کہانی ہے؟ تصویر سے بہت پہلے

قُیود کے کئی اسرار ہم پہ کھولے گئے
زمیں پہ جنبشِ زنجیر سے بہت پہلے

کبھی کبھی مجھے لگتا ہے شعر کہتے ہوئے

ملی ہے روح کہیں، میرؔ سے بہت پہلے

سلگتی دھوپ بڑھائی گئی تھی صحرا میں

خنک ہواؤں کی توقیر سے بہت پہلے

یہ فیصلہ بھی ہوا، دل ضرور رکھنا ہے

ہر ایک سینے کی تعمیر سے بہت پہلے

صدائیں میری بھی گونجی ہیں پچھلی صدیوں میں

کہیں تو وہ بھی رہی، ہیر سے بہت پہلے

قبول ورَد میں سبھی لفظ مبتلا تھے نوید

کسی کے حسن کی تشہیر سے بہت پہلے

غزل

ایسے بازار میں بنتا ہے بھلانا مجھ کو

کبھی دیکھے گا پلٹ کر یہ زمانا مجھ کو

ابھی خیمے سے نکلنے کی اجازت دے دو

بچ گیا سر تو کئی بار بلانا مجھ کو

دیکھ لینا! کہیں سائے نہ جھلسنے لگ جائیں

ان درختوں سے کہیں دور اُگانا مجھ کو

وہی کشتی، وہی دریا، وہی دو چار بھنور

کوئی طوفان بڑا آئے بتانا مجھ کو

جھلملائے تھے مرے عکس نگاہوں میں تری

اپنی تصویر کسی روز دکھانا مجھ کو

میرے خوابوں کو یہاں شور کچل ڈالے گا

وقت جب بھیڑ ادھیڑے تو جگانا مجھ کو

تیرے خوابوں سے مٹا دوں گا میں وحشت ساری

کبھی سوتے ہوئے آنکھوں میں سجانا مجھ کو

تم نے جو گیت عقیدت میں بُنا میرے لیے

ڈھول والے کہیں جائیں تو سنانا مجھ کو

خرچ کرنے پہ منافع ہی منافع ہو گا

جھڑ گئے جب یہ خسارے تو کمانا مجھ کو

آئینے سے مجھے آتا ہے بہت خوف نوید

عکس کہتا ہے مرا کر دو روانہ مجھ کو

غزل

ہیں منجمد قدم کوئی دیوار بھی نہیں

کتنے عجیب لوگ ہیں بے زار بھی نہیں

آسانیوں سے ہم کو بلندی نہیں ملی

یعنی کسی پہاڑ میں اک غار بھی نہیں

آنکھیں اسی لیے ہیں بہت مضطرب یہاں

تھوڑے سے اشک ہیں جو سمجھدار بھی نہیں

نوچا اداسیوں کو، تو کہنے لگا سکوت
افسوس! تم تو ڈھنگ کے بدکار بھی نہیں

اک قبر ہے کہ جس پہ منائیں پرند عرس

اک گاؤں ہے جہاں کوئی دربار بھی نہیں

حیران ہوں کہ دل میں وہ اتری ہے کس طرح

خواہش جو ذائقے میں مزیدار بھی نہیں

کیا کیا نہ ہو گیا مری خوشیاں نکھارنے

کہنے کو میرا باپ زمیندار بھی نہیں

کوشش تو کر رہاں ہوں نظر آئے دکھ مرا

لیکن میں اتفاق سے فنکار بھی نہیں

حسرت سے ڈالتا ہے وہ زنداں پہ اب نگاہ

جو شخص قید میں ہے، گرفتار بھی نہیں

آنکھوں میں عکس عکس نے اوڑھے عجب سے رنگ

اے زیست! تیری عید تو اس بار بھی نہیں

تم کر رہے ہو بات نوید احتجاج کی

اب تو لبوں پہ نام کا اظہار بھی نہیں

غزل

زندگی کیا ہے تمناؤں کا کھارا پانی
ہر کوئی پی کے یہاں مانگے دوبارا پانی

کئی دریا مری آنکھوں سے رواں ہونے لگے
اُس نے جب خواب میں اک بار پکارا، پانی

کوئی سیلاب امڈ تا تھا گھڑی سے ہر دن
وقت کی شکل میں ہم نے تو گزارا پانی

اس لیے لوگ سلگتے ہیں کسی کربل میں
جسے ملتا ہے وہ پی لیتا ہے سارا پانی

فیصلہ اُس نے جدائی کا سنایا تو لگا
جیسے صحرا میں کوئی پیاس میں ہارا پانی

آج جذبات ہیں پیاسے سرِ قرطاس نوید
کر رہا ہے مجھے ہر لفظ اشارا پانی

غزل

آنکھوں میں جب سے دفن ہیں گھر بار مختلف

اگنے لگے ہیں خواب میں آثار مختلف

پہلے بھی روح کو تھا بدن ہی کا سامنا

کیوں لگ رہی ہے آج یہ دیوار مختلف

ملتا ہے روز مجھ کو ڈرامہ وہی قدیم

لیکن نبھا رہا ہوں میں کردار مختلف

اِس عہد پر ہر ایک شکاری کی ہے نگاہ

اور گونجتی ہے خوف میں چہکار مختلف

میں نے بجھا دیے ہیں کئی مضمحل چراغ

لوَ دے رہے تھے مجھ کو لگاتار مختلف

اک قبر پر گیا تھا کوئی مانگنے دعا

اور دیکھتے رہے اسے دربار مختلف

یا میں ہوں بچپنے کے تصرف میں اب نوید

یا سچ میں ہو گیا ہے، یہ بازار مختلف

غزل

پرائے رنج و غم کے ساتھ کچھ ذاتی بھی ہوتے ہیں
محبت کرنے والے لوگ جذباتی بھی ہوتے ہیں

ضروری تو نہیں ہوتا، چھلک جائیں جدائی میں
بہت سے اشک آنکھوں میں مُکافاتی بھی ہوتے ہیں

تمہارے کام شاید دوستی آئے نہ جرگے میں
ہمارے فیصلے اب تک، مُساواتی بھی ہوتے ہیں

ہمارے بعد ہر موسم اڑانیں پڑھ کے بولے گا
کئی پنچھی زمانے میں، مہماتی بھی ہوتے ہیں

مرے سینے میں خوشیاں پھیلنے لگتی ہیں صدیوں کی
وہ آئے تو کئی لمحے طلسماتی بھی ہوتے ہیں

ہوا کا شور کرنا میرے دروازے پہ بنتا ہے

مرے گھر میں چراغ اکثر، مُضافاتی بھی ہوتے ہیں

ہماری چھاؤں میں آ کر، وہ اک دن مان جائے گا

شجر کچھ تپتے صحرا میں، کراماتی بھی ہوتے ہیں

چلی آتی ہے محفل میں بھی ڈسنے مجھ کو مایوسی

امید اُس سے ملے تو ساتھ باراتی بھی ہوتے ہیں

چلو مل کر وہی کردار افسانوں سے کاٹیں ہم

ہو جن کی حکمرانی اور خیراتی بھی ہوتے ہیں

-

غزل

تڑپ کے سانپ جگہ اِس لیے بدلتے تھے

کئی چراغ مری آستیں میں جلتے تھے

مجھے نشانے پہ رکھتے تھے جب بھی میرے عَدو

کماں سے تیر کسی اور کے نکلتے تھے

چَہکنے والے تھے پنچھی مرے قبیلے کے

اور اُن کو دیکھ کے پنجرے سبھی پگھلتے تھے

ہر ایک شخص نے سورج بجھا دیا اپنا

کہ جب شجر بھی مری اِقتِدا میں چلتے تھے

وفا کے رستے پہ تم بوند بھر چلے بھی نہیں

اور اُس پہ شور، کہ، سیلِ رواں کچلتے تھے

وہ میرے ساتھ رہے، حوصلہ بڑھانے کو

غموں کی بھیڑ میں جِن جِن کے خواب پلتے تھے

اذان دیتا رہا اُس نگر میں کوئی غریب

مصیبتوں میں جہاں سب خدا بدلتے تھے

گرا سکی نہ ہوا زندگی کی شاخوں سے

ہمارے ہاتھ پسینے میں جب پھسلتے تھے

غزل

آ گیا ہے نام اس کا، دل لگی کے کھاتے میں

اب وہ مارا جائے گا، عاشقی کے کھاتے میں

فائلیں کھلیں گی جب، یار! ہر زمانے کی

سب چراغ آئیں گے، روشنی کے کھاتے میں

کیا نہیں دیا رب نے، کیا نہیں ملا مجھ کو

آپ ہی نہیں تھے بس، زندگی کے کھاتے میں

زندگی کے سطروں سے عظمتیں ٹپکتی ہیں

کربلا کے غم آئیں، جب کسی کے کھاتے میں

موسموں کی پریوں میں اس نے حسن بانٹا جب

کچھ کمی نہیں آئی، دلکشی کے کھاتے میں

پیار سے اسے ڈانٹا، اس کی بے وفائی پر

اس نے یہ بھی لکھ ڈالا، بے رخی کے کھاتے میں

آج میں نے کھودی جب، قبر ایک صفحے کی

دفن تھی کوئی خواہش مفلسی کے کھاتے میں

کیا کریں تعلق کا کھول کر رجسٹر ہم

کچھ بھی تو نہیں لکھا، دوستی کے کھاتے میں

سورجوں کا آڈٹ بھی، ہو گیا مکمل جب

ایک بھی نہ تھا جگنو، تیرگی کے کھاتے میں

کاش! مجھ سے محفل میں کوئی تو یہ پوچھے اب

کتنے غم چھپائے ہیں، اک ہنسی کے کھاتے میں

مجھ کو زخم دے کر بھی لاجواب کر دے گا

ہر جفا وہ ڈالے گا، بے بسی کے کھاتے میں

ہر غزل سے گر اس کا، تذکرہ نکل جائے

کچھ بھی تو نہیں بچتا، شاعری کے کھاتے میں

تھا عجب جنوں اپنا، پانیوں کی باری پر

ہونٹ رکھ دیے میں نے تشنگی کے کھاتے میں

دھوپ میں جھلنے سے دشت دھول کرنے سے

عشق بڑھتا رہتا ہے، آدمی کے کھاتے میں

اے خدا اجالا ہو، جس سے روزِ محشر میں

لکھ دے ایسا اک سجدہ بندگی کے کھاتے میں

غزل

کیسی ہوائیں، کیسا شجر، وہ کہیں نہیں
سایا سمیٹ لوں گا اگر وہ کہیں نہیں

دریا! کسی بھی کام کی شفقت نہیں تری
اب کھول دے تو سارے بھنور وہ کہیں نہیں

اے دل میں تیرے ساتھ کہاں تک نہیں گیا
اک ساتھ ہو گا اب نہ سفر، وہ کہیں نہیں

ہم سے کہا چراغ کی بجھتی نگاہ نے
کس کا کرے طواف نظر، وہ کہیں نہیں

اِس روشنی میں ایک ستارے کی ہے مہک
کس نے اڑائی ہے یہ خبر وہ کہیں نہیں

یہ کہہ رہی ہے نیند، ہر اک خواب جھاڑ کر

میلہ لگا ہوا ہے مگر وہ کہیں نہیں

غزل

جس کے شانوں پہ ہر اک شے ہے پرَائی، بھائی
اُس سے بنتی ہی نہیں میری لڑائی، بھائی

کیوں اُسی شخص کی قسمت میں ہیں کڑوے لمحے
جس نے خوابوں میں بھی بانٹی ہے مٹھائی، بھائی

میں کسی اور کے پیروں سے زمیں کیوں کھینچوں
میرے مالک نے مجھے دی ہے چٹائی، بھائی

یوں تو دعوؤں سے بھری جیبیں لبوں پر ہیں کئی
وقت جذبوں کی دکھائے گا کمائی بھائی

نام آیا مرے ہونٹوں پہ کسی مجرم کا
چاروں جانب سے امڈ آئی خدائی، بھائی

سرد لہجوں کے برسنے سے خبر ہو گی نوید
کون سردی میں ہمیں دے گا رَضائی، بھائی

غزل

نگاہ کچلی گئی، زاویہ مٹایا گیا

پھر اُسکے بعد عجب سلسلہ بچھایا گیا

اسی لیے ہمیں دن رات کی خبر ہی نہیں

ہمارے شہر میں سورج بجھا کے لایا گیا

وہ بدزبان سماعت مری خراشتا تھا

وہ جانتا تھا مجھے گھر میں کیا سکھایا گیا

کوئی ملا تو ثمر چاہتوں کا لے کے گیا

ہمارے ہاتھوں میں جیسے شجر اُگایا گیا

وہی درخت تفاخر سے سانس لینے لگے

کہ اپنا سایا بھی جن سے نہیں بنایا گیا

قلم کو پیاس ہے اب تک بہت سے لفظوں کی

کچھ ایسا ہے جو کسی اور کو سکھایا گیا

ہر ایک سمت سے سورج کا سامنا تھا ہمیں

ہمارے سائے کو بانٹا گیا، مٹایا گیا

کہاں زمانے کی لہریں کھلی ہیں سب پہ نوید

کسی کسی کو یہ دریا نہیں سنایا گیا

غزل

زندگی سب کی نبھانے کے لیے ہوتی ہے
دوست! دنیا تو بنانے کے لیے ہوتی ہے

جس پہ لڑتے ہوئے دھُل جائے عداوت ساری
ایسی ہر بات بڑھانے کے لیے ہوتی ہے

یہ روایت بھی یہاں ڈال گئے اہلِ جنوں
گھر کی تعمیر گرانے کے لیے ہوتی ہے

ایک کشتی ہمیں ملتی ہے سفر سے پہلے
اور وہ کشتی بھی جلانے کے لیے ہوتی ہے

شکل ہر روز بدلتا ہے دِیا ایسا نوید
جس کی تصویر دکھانے کے لیے ہوتی ہے

غزل

چھینکے بھنور کہیں پہ، کنارا کسی کے پاس
اُس نے بھی رکھ دیا ہے خسارا کسی کے پاس

جلتا رہے گا اُس کی تپش سے وہ عمر بھر
لمحہ جو میں نے آج گزارا کسی کے پاس

میں اُس کی کائنات، وہیں دھر کے آ گیا
تھا آسماں کسی کا، ستارا کسی کے پاس

چمکا رہا تھا مجھ کو کوئی اور آئنہ
اُس نے بھی اپنا رنگ نکھارا کسی کے پاس

مجھ کو کچھ اس طرح سے "وصالا" ہے عشق نے
ہمت نہیں کہ جاؤں، دوبارہ کسی کے پاس
اب خواب کا نہیں ہے، ٹھکانہ کوئی نوید
ان کا ہمارے پاس، ہمارا کسی کے پاس

غزل

میں نے جو کچھ بھی درختوں سے کمایا دوں گا

خود جھلستے ہوئے ہر شخص کو سایا دوں گا

ویسے اِسکول کے ماحول سے محروم رہا

اک محبت نے مجھے جو بھی سکھایا دوں گا

وہ تو جگنو بھی نہیں دینے پہ مائل ابھی تک

میری مٹھی میں اگر تارا بھی آیا دوں گا

مجھ سے لے جاؤ مری زیست کا اک آدھ بھنور

لوٹ آئے تو سمندر کا بقایا دوں گا

کاش بچپن میں ہی یہ راز عیاں ہو جاتا

میں بدن میں بھی رہوں گا تو کرایا دوں گا

زندگی چاہیے میری تو سوال ایسے نہ کر

یار اک بار تجھے میں نے بتایا دوں گا

غزل

دریا کو شعلگی سے سجانا پڑا تو پھر؟

آنکھوں پہ دل کی آگ کو لانا پڑا تو پھر؟

طغیانیوں کی سمت نہ اتنا دھکیلیے

مجھ کو کسی غرض سے بلانا پڑا تو پھر؟

بیٹا! یہ روشنی تجھے ورثے میں دوں مگر

تجھ کو بھی ہر چراغ بچانا پڑا تو پھر؟

گھر بار کی فضا میں، اڑانیں نہ ضبط کر

ان بیٹیوں کو رزق کمانا پڑا تو پھر؟

غزلیں مشاعَروں میں پڑھو تم خرید کر

لیکن یہ فن کسی کو سکھانا پڑا تو پھر؟

بکھری پڑی ہیں کتنی محبت کی فائلیں

ہم کو یہ سارا کام مُکانا پڑا تو پھر؟

دعوے حسینیت کے بہت کر رہے ہو تم

صحرا میں کوئی خیمہ لگانا پڑا تو پھر؟

محشر میں جب سوال ہوا بے وفا تھا کون

مجھ کو تمہارا نام بتانا پڑا تو پھر؟

کیوں بیچ ڈالے گاؤں کے سارے درخت دوست

مڑ کر انھی کی چھاؤں میں آنا پڑا تو پھر؟

بے شک نوید نیند کی کھڑکی کھلی نہ رکھ

خوابوں کو جب بھی شور مچانا پڑا تو پھر؟

غزل

ہر طرف پرندے ہیں راستہ مناسب ہے

دل کی بات کہنے کو اور کیا مناسب ہے

ایک ساتھ چلنے کے، راستے ہزاروں ہیں

لیکن اب میں سوچوں گا، کونسا مناسب ہے

درمیاں ہمارے اب، چار پانچ صحرا ہیں

قربتیں مٹانے کو، فاصلہ مناسب ہے

ڈھل رہا ہے سورج بھی، چل رہی ہیں تلواریں

اب نماز پڑھنے کا، فیصلہ مناسب ہے

مت بھرو اڑانیں یوں، عرش تک پہنچے کو

ہم فقیر لوگوں کا، ضابطہ مناسب ہے

غزل

کسی فقیر نے جب سے کہا، کہ لکھتے رہو
بضد ہے تب سے مرا آئنہ، کہ لکھتے رہو

ہمکتے حرف مدینے کی سمت جب دیکھیں
قلم بھی دیتا ہے مجھ کو دعا، کہ لکھتے رہو

کوئی امید ورق پر ابھی کھِلی بھی نہیں
سندیسہ لائی ہے بادِ صبا، کہ لکھتے رہو

میں خود ہی بن کے شجر، اپنی چھاؤں میں بیٹھا
کسی پرندے نے یہ دی صدا، کہ لکھتے رہو

جو زرد پتّے تھے مجھ پر وہ جھڑنے لگ گئے تھے
ہر ایک شاخ نے کی التجا، کہ لکھتے رہو

اسی لیے کئی غزلیں میں لکھ کے پھونکتا ہوں

نشے میں سب سے ہے بڑھ کر نشہ، کہ لکھتے رہو

بہت سے لفظوں کی حرمت بھی پائمال ہوئی

چلی ہے شہر میں جب سے ہوا، کہ لکھتے رہو

بدن تمہارا ہر اک شعر پر ادھڑ تا رہے

کوئی سنائے تمہیں بھی سزا، کہ لکھتے رہو

نوید لوگ کتابوں سے اب نکل پائیں

ہے بات یہ بھی تمہاری بجا، کہ لکھتے رہو

غزل

بدن کو خاک بنا کر کہیں اڑا دوں گا
میں تیری آنکھوں میں تارے سبھی جگا دوں گا

نہیں ہے کوئی یہاں، قدر داں چراغوں کا
سو اپنا لہجہ کسی موڑ پر بجھا دوں گا

تجھے صداؤں کے چشمے دکھانا چاہتا ہوں
میں سارے شہر میں اب خامشی بچھا دوں گا

اٹھا نہ پائے گی یہ کائنات عکس مرے
جو آئنے بھی ہیں تصویر میں مٹا دوں گا

تمہارے خوابوں میں خوشبو مری سمائے گی
تمہاری آنکھوں میں خود کو کہیں اُگا دوں گا

غزل

ہزاروں بار جو بنتے ہیں محور ٹوٹتے ہیں

مرے بستر پہ سارے خواب تھک کر ٹوٹتے ہیں

-

ٹپکتا ہے کسی تصویر سے جب لمس اُس کا

مری آغوش میں آکر سمُندر ٹوٹتے ہیں

-

تمہارے بعد ہاتھوں پر نہیں چھپتیں یہ گھڑیاں

الجھ کر خود سے اب لمحوں کے یاوَر ٹوٹتے ہیں

ابلتی ہیں تماشوں پر یہاں لوگوں کی آنکھیں

ہمارے اشک بھی سینے کے اندر ٹوٹتے ہیں

کسی کا نام ہونٹوں پر بس اک دن جھلملایا

ستارے تب سے آکر میری چھت پر ٹوٹتے ہیں

غزل

کچھ اپنے جیسے پرندے یہاں بناتے ہیں
پھر اس کے بعد نیا آسماں بناتے ہیں

اب آئنوں سے چھلکتے ہیں بے حسی کے عکس
جو نوچتے ہیں بدن، تتلیاں بناتے ہیں

وفا نے بوسہ دیا اور جبیں پہ ابھرا چراغ
اِسی کو توڑ کے ہم کہکشاں بناتے ہیں

بتا رہی ہیں خراشیں تمہارے لہجے کی
تمہارا گھر ہے جہاں، بَرچھیاں بناتے ہیں

یہ آپ لفظوں سے کرتب دکھا رہے ہیں کسے
اب آپ شعر نہیں، پھرتیاں بناتے ہیں

وہی پہنتے ہیں موسم ہمارے سینوں میں
ہم اپنی مرضی سے جو وردیاں بناتے ہیں

ہمارے حجرے کو دیکھیں فرشتے حیرت سے
بچھا کے جب بھی جبیں، پستیاں بناتے ہیں

ٹھہرنے لگتے ہیں لہجوں سے قربتوں کے سفیر
چلو کہ مل کے یہاں جرسیاں بناتے ہیں

تم اپنی پلکوں سے لکھو فسانے بیتے ہوئے
ہم اپنی آنکھوں سے کچھ تختیاں بناتے ہیں

یہ اور بات کہ اپنا نہیں ٹھکانہ کوئی
یہ اور بات کہ ہم بستیاں بناتے ہیں

فصیلِ ہجر سے لپٹے ہوئے یہ اندیشے
کسی امید کا نقشہ کہاں بناتے ہیں

ہمارے پاس مقدر کا سادہ کاغذ ہے
کہو تو خود کو بدن، تم کو جاں بناتے ہیں

کئی سراب جکڑنے لگے ہمارے قلم
بس اتنا سوچا تھا آبِ رواں بناتے ہیں

غزل

دریا جو کبھی دیکھے کسی اور نظر سے
تم باندھ کے آ جانا مرا نام بھنور سے

اک گاؤں سے پہنچی ہوئی آہٹ سے لپٹنے
یہ شہر الجھتا ہے کسی راہگزر سے

طوفاں کو بتاؤ کہ چلا آئے مرے گھر
کچھ اور نکھر جائے گا وحشت کے اثر سے

یادوں نے کسی نام کا اک پھول اُگایا
بنتے ہی گئے باغ مرے "دیدہء تر" سے

اب دھول نہیں میری جبیں پر ہیں اجالے
میں لوٹ کے آیا ہوں ستاروں کے سفر سے

غزل

جو بھی فہرست بنائے گا، نکالے گا ہمیں

دور اِک ہو گا چراغوں کا، اُجالے گا ہمیں

روند ڈالیں گے یہاں لوگ صداؤں کی طرح

شہر کا کوئی مؤرخ ہی سنبھالے گا ہمیں

جب اندھیروں میں سکوں ہو گا میسر سب کو

ایک جھونکا کسی وحشت کا بچا لے گا ہمیں

یہ شجر جس کی گھنی چھاؤں نے گھیرا ہوا ہے

اب نہ جھلسیں گے اگر دھوپ میں "کھا" لے گا ہمیں

ہم نے بیعت کے تقاضوں کا جو پرچار کیا

وقت نیزوں پہ کسی روز اچھالے گا ہمیں

غزل

اس لیے میں نے کنارا کر لیا اشجار سے
سب کے سب پنچھی مجھے لگنے لگے بے زار سے

شہر کے ہر کینوس سے جب زبانیں مٹ گئیں
میرے لفظوں کے گھڑے بھرنے لگے اظہار سے

اے خدا! کس ہاتھ سے روشن ہوئے سارے چراغ
روشنی میری طرف آئی نہیں دیوار سے

ماں کی خدمت کر رہا تھا لوگ تھے جب عرس پر
میری چھت پر سب کبوتر آ گئے دربار سے

ابتدا دونوں طرف کی تشنگی سے ہو گئی
اب کہانی ختم ہو گی آپ کے انکار سے

یاسیت پھیلے گی اتنی آنے والے دور میں

کِھل اٹھے گی گھونسلے میں زندگی چہکار سے

جتنی تیزی سے ابھرتے ہیں بھنور میرے خلاف

بڑھ رہی ہے میری کشتی بھی اُسی رفتار سے

کیا مرے ہر خواب کو نوچا نہیں اِس شور نے

کیا نوید آنکھیں مری مل جائیں گی بازار سے

غزل

منزل سے پہلے ہونگے سبھی کارواں الگ

سوچیں گے راستے میں، کہ ہم ہوں کہاں الگ

وحشت پکارتا ہوا آیا ہر ایک شخص

باندھا ہوا ہے دشت میں ہم نے سماں الگ

حرفوں کے سب پرندے اترتے ہیں منفرد

ہم پر خدا کے فضل سے ہے آسماں الگ

میں نے کسی کی چاہ میں تالے نہیں لیے

جب سے بنایا شہر میں اپنا مکاں الگ

اگلا محاذ تم نے اگر جیتنا ہے دوست!

ساماں سے کر دو آج ہی تیر و کماں الگ

میں چاہتا تھا پھول یہاں مل کے بیچتے

میں چاہتا تھا ہو نہ ہماری دکاں الگ

جرگہ بلا لیا ہے سبھی تتلیوں نے آج

بیٹھا ہوا ہے باغ میں اک نوجواں الگ

پرچہ ملا مجھے تو کئی رو پڑے فقیر

میرا ہوا ہے عشق میں ہر امتحاں الگ

تنہائیوں میں نفل میں جتنے پڑھوں ہیں کم

صد شکر اے خدا! کہ ہوئے بدگماں الگ

منظر کا ذائقہ مری آنکھوں میں ہے کچھ اور

میں بھی اٹھائے پھرتا ہوں اپنا جہاں الگ

ویران ہو گئی ہے مری آستیں نوید

جب سے ہوئے ہیں مجھ سے کئی مہرباں الگ

غزل

ہر اک تارا ہمیں پہچانتا ہے

فلک بھی معتبر گردانتا ہے

بقا کی منزلوں تک لے کے جائے

کسی کو عشق جب مہمانتا ہے

صحیفہ منفرد ہے ہر نگہ کا

ہر انساں اپنی آیت مانتا ہے

مرا ہر لفظ اب شوقِ نمو میں

تمہارے عکس ہی کو ٹھانتا ہے

جکڑتی ہیں مری شاخیں ہوائیں

ہر اک لمحہ مجھے زندانتا ہے

بکھر جاتے ہیں خد و خال میرے

مجھے یہ آئنہ انسانتا ہے

الجھتے ہیں بھنور ہر روز مجھ سے

سمندر کیوں مجھے طوفانتا ہے

غزل بر مصرع–ترا بھید کھُل نہ جائے

ہیں تمام حرف لرزاں، یہ قلم چلے کہاں سے

"ترا بھید کھُل نہ جائے، مرے غم کی داستاں سے"

نہیں ایک جیسی مٹی، ہے سرشست اپنی اپنی

کوئی چاک سے نہ اترا، کوئی جی اٹھا اذاں سے

مجھے سُن کے لفظ ہوں میں، نہ دکھائی دوں گا تجھ کو

مجھے تو بتا دے اتنا، کہ مٹا تھا میں کہاں سے

کسی آستاں پہ جا کر، مرا رنگ اجل گیا ہے

وہی داغ میرے چمکے، جو ملے تھے اِس زماں سے

مرا دل چہک رہا تھا، یہ نظر اڑان میں تھی

کوئی عکس مل گیا تھا، مجھے پردہء گماں سے

یہ جو ہیں فقیر ان میں، ذرا بیٹھ ذکرِ "ھو" کر

تجھے کچھ نہیں ملے گا، کسی اور کہکشاں سے

تھی رضا نوید رب کی، کہ صدا مری بھی گونجی

کئی در بنے فلک پر، مرے نالہ و فغاں سے

غزل

عکس ہوں اور یہیں بنا ہوا ہوں
میں دیے کے قریں بنا ہوا ہوں

یہ جو پیکر مرا ہے جوڑ اِسے
آ گیا ہے یقیں بنا ہوا ہوں

آئنہ دیکھ کر کہے اس کو
میں بھی کتنا حسین بنا ہوا ہوں

مجھے سیلاب ہی ابھارے گا
یعنی زیرِ زمیں بنا ہوا ہوں

کوزہ گر روح پھونک دے مجھ میں
جس جگہ تھا وہیں بنا ہوا ہوں

کر لے تسلیم اب تو میرا وجود
دیکھ اپنی جبیں بنا ہوا ہوں

ڈھونڈ لاؤں فلک سے خود کو نوید
میں وہاں بھی کہیں بنا ہوا ہوں

غزل

ایک بجھ جائے تو پھر دوسرا جلتا ہے چراغ
ہے کوئی جو مرے سینے میں بدلتا ہے چراغ

خواہشیں جس کی اندھیروں نے بہت روندی ہوں
اس کے ہونٹوں سے بس اک لفظ نکلتا ہے چراغ

جس کے قدموں کو ترستی ہے جبیں منزل کی
اُسے رستے کے کسی موڑ پہ ملتا ہے چراغ

جتنے سکے ہیں انھیں راہ میں پھینک آؤ میاں
یہ فقیروں کا نگر ہے یہاں چلتا ہے چراغ

جسے ہونٹوں پہ سجانے سے ستارے دھڑکیں
اُس سخن کے کسی گوشے میں مچلتا ہے چراغ

جب زمانے کی ہتھیلی سے اجالے مٹ جائیں
یہ روایت ہے ازل سے کہ نکلتا ہے چراغ

غزل

نہیں اٹھا چراغوں سے دھواں سب ٹھیک لگتا ہے
کہ روشن ہے ابھی سارا مکاں سب ٹھیک لگتا ہے

ہزاروں بار یہ دنیا مرے دل کو تسلی دے
مگر اس خاکی پیکر کو کہاں سب ٹھیک لگتا ہے

نہیں آتے مسلسل راستے ہموار دنیا میں
سنبھل کر تم وہاں چلنا جہاں سب ٹھیک لگتا ہے

ہمیشہ سوچتا ہوں تیر کھانے سے ذرا پہلے
نہیں آئی نظر کوئی کماں سب ٹھیک لگتا ہے

تو کیا وہ جھوٹے وعدے تھے کیے جو عشق میں ہم نے
یہاں سب ٹھیک لگتا ہے وہاں سب ٹھیک لگتا ہے

غزل

چھپائے بیٹھے تھے کچھ نقش اِس زمانے سے

ہم اُن کو آئے نظر تیرگی کے چھانے سے

وگرنہ کھُلنے کہاں تھے عدم میں عکس کئی

ہمارا چرچہ ہوا، آئینے میں آنے سے

ہمارا نام روایت سے ہٹ کے مہکا یہاں

ہمارے لفظ کھِلے، آسماں بچھانے سے

اب ان اجالوں میں نام ونشاں نہیں اُن کا

مُکر گئے جو دیے، روشنی اٹھانے سے

نجانے کتنے سفر، جھلملائے دنیا میں

نہیں چمکتے یہ رستے قدم بجھانے سے

غزل

جب سے یہ ہوئی سب کو خبر دیکھ رہا ہوں
چہروں پہ اُبھرتے ہوئے ڈر دیکھ رہا ہوں

معلوم ہے پرواز کی تو ٹھان رہا ہے
میں تیرے سمٹتے ہوئے پر دیکھ رہا ہوں

لگتا ہے سمندر کو کوئی خوف ہے مجھ سے
بنتے ہوئے ہر سمت بھنور دیکھ رہا ہوں

اب جاں پہ گراں ہونے لگے سارے تماشے
یہ ہونٹ مقّفل ہیں مگر دیکھ رہا ہوں

بڑھتے ہی چلے جائیں قدم میرے جنوں میں
مشکل ہے مرا سارا سفر دیکھ رہا ہوں

کل صبح تلک اُس کو شجر پر نہیں رہنا
کس شاخ پہ ہے تیری نظر دیکھ رہا ہوں

غزل

اک باغ کا شباب، مری کھوج میں رہا

یعنی کوئی گلاب، مری کھوج میں رہا

آئینہ بول اٹھا مجھے اک روز دیکھ کر

یہ خانماں خراب، مری کھوج میں رہا

کچھ لوگ میری ہار پہ ہنستے رہے مگر

اک شخص کامیاب، مری کھوج میں رہا

دنیا ترس رہی تھی اجالوں کو دیکھنے

بے حال آفتاب، مری کھوج میں رہا

دیوار و در میں ڈھونڈنے صحرا چلا گیا

گھر میں کوئی سراب، مری کھوج میں رہا

نسبت کسی کے در کی مرے کام آگئی

ورنہ ہر اک عذاب، مری کھوج میں رہا

جس کو نہ مل سکا میں، اُسے وہم تھا کچھ اور

جس کو تھا دستیاب، مری کھوج میں رہا

میرا وہی سوال، کہاں تھا ترا نوید

تیرا وہی جواب، مری کھوج میں رہا

غزل

جو دن مرے بغیر گزارے حساب دے
بنتا ہے میرا کہنا کہ سارے حساب دے

اپنی بِساط سے جسے بڑھ کر عطا کیا
اب بھیڑ میں وہ شخص پکارے حساب دے

مر کر زمین سے مجھے کہنا ہے ایک دن
جتنے بھی تیرے قرض اتارے حساب دے

رستوں کو روند کر ترا بڑھنا عبث گیا
کس خاک میں تھے کتنے ستارے حساب دے

بہتا ہے کیوں رگوں میں بہت شور اب نوید
دل تُو نے کتنے زخم اُبھارے حساب دے

غزل

میں قدم جب بھی اٹھاتا ہوں سفر بنتے ہیں
کئی رستے مرے ہونے سے اِدھر بنتے ہیں

کوزہ گر چاک گھماتے ہوئے یہ بھی تو بتا
حوصلے کون سی چکّی میں کدھر بنتے ہیں

آپ سورج ہی سہی دھوپ کی دھمکی تو نہ دیں
آپ جیسے تو مرے زیرِ اثر بنتے ہیں

اُس بغاوت سے بھلا کیوں تجھے نفرت ہے بہت
جس سے دنیا میں کئی اور نگر بنتے ہیں

کشتیاں ہم نے بچانی ہیں نئی نسلوں کی
توڑ دو سارے بھنور جو بھی جدھر بنتے ہیں

اب چھڑکتا ہوں سیاہی تو ورق پر یکدم
میرے اِس دیس کے ٹوٹے ہوئے گھر بنتے ہیں

کئی صحرا مری سوچوں پہ اُبھرتے ہیں نویدؔ
ہے کوئی جس کی دعاؤں سے شجر بنتے ہیں

غزل

یہ تو حرفوں کا مقدر ہے سمائے تارے
میں نے افلاک سے کب ڈھونڈ کے لائے تارے

اِس خطا پر مجھے استاد نے انعام دیا
میں نے ٹیبل پہ سیاہی سے بنائے تارے

ہجر سے قبل مجھے حوصلہ اِتنا کب تھا
میری پلکوں نے ترے بعد اٹھائے تارے

رنج یہ ہے کہ اُسے دیکھنا آتا ہی نہیں
اور اِس بات پہ خوش ہوں کہ کمائے تارے

تیرگی میں وہ ترے کام بہت آئیں گے
ہم جو محفل میں تری چھوڑ کے آئے تارے

غزل

نیندوں سے خواب خواب کا بستہ اتار دیں
ہم سے اب اپنی یاد کا غلبہ اتار دیں

آیا ہوں اپنے جسم پہ دنیا کو اوڑھ کر
مرضی ہے آپ کی اِسے جتنا اتار دیں

اتنی بڑی کتاب، تو کاندھوں پہ بوجھ ہے
بہتر یہی ہے آپ بھی چربہ اتار دیں

اُن کے قریب جا کے جمال آ ہی جائے گا
اس آئینے سے اپنا یہ چہرہ اتار دیں

بغداد ہم گئے تو فقیروں نے یہ کہا
اپنی زباں سے غیر کا لہجہ اتار دیں

ہوتا ہے نیتوں سے ہمارا مکالَمہ
حسن و شباب پر ہے جو خطرہ اتار دیں

ہم کو خیال ہے یہاں اوروں کے رنج کا
ورنہ ہر ایک آنکھ میں دریا اتار دیں

غزل

وہ تھوڑی دیر کو آئے تھے مسکرا کے چلے
پھر اُس کے بعد کئی تذکرے صبا کے چلے

بجھے چراغ نگاہیں خراش دیتے ہیں
وہ میرے شہر جب آئے تو مسکرا کے چلے

ہمارے عکس کی فصلیں اُنھی سے پھیلیں گی
جو آئنے تری دنیا میں ہم اُگا کے چلے

لگے نہ ہاتھ محبت کے چند سکے بھی
متاعِ قربتِ جاناں مگر کما کے چلے

سفر عدم کی طرف اِس طرح کیا ہم نے
ہمارے بعد کئی ضابطے فنا کے چلے

غزل

ان آنکھوں کو بتانا آگیا ہے
کوئی آنسو پرانا آگیا ہے

چراغ اک ایک کر کے بجھ رہے ہیں
ہواؤں کا زمانہ آگیا ہے

مرے لفظوں کو پنجرے گھورتے ہیں
اِنھیں بھی چہچہانا آگیا ہے

سروں میں منقسم جب سے ہوا ہوں
تمہیں بھی گنگنانا آگیا ہے

لبوں نے اوڑھ لی ہے خوش کلامی
یہ غصہ عاجزانہ آگیا ہے

عجب سا خوف طاری ہے ورق پر
قلم کو سر اٹھانا آگیا ہے

نوید اب آہٹیں در پیش ہیں کچھ
مری سانسوں کو آنا، آگیا ہے

غزل

کئی شکوے ہیں مگر ہونٹ پہ لانے کے نہیں
زندگی تیرے فسانے بھی سنانے کے نہیں

ہم نے پائے جو دِیے اپنا خسارا کر کے
وہ اندھیروں میں کسی کام بھی آنے کے نہیں

ہم پرندوں کو غلیلوں سے ڈرائے نہ جہاں
مر تو جائیں گے مگر شاخ سے جانے کے نہیں

خواہشیں روند بھی سکتا ہوں کسی رستے میں
بوجھ ہوتے ہیں مگر سارے اُٹھانے کے نہیں

جانے کیوں فصل اُگی خوف کی نیندوں پہ نوید
یہ مرے خواب ترے خواب زمانے کے نہیں

غزل

مکاں بیچا نہیں میں نے گزارا چل رہا ہے
ندی اپنی جگہ پر ہے کنارا چل رہا ہے

عبادت میں ابھی مشغول ہیں ان کو نہ چھیڑو
وفا کس سے کریں گے استخارہ چل رہا ہے

میں خود پرواز سے اپنی پریشاں آجکل ہوں
زمانہ ہے زمیں پر اور بچارا چل رہا ہے

نہ سمجھاو، مجھے یوں ہیر اور رانجھے کا چکر
وہی ہے نا! جو برسوں سے ہمارا چل رہا ہے

ابھی کچھ دیر پہلے جس کو راضی کر لیا تھا
نوید اُس سے مرا جھگڑا دوبارہ چل رہا ہے

غزل

دل کاسہ بنا کر اُسے دیکھا نہیں کرتا
میں اپنی امیدوں کا تماشا نہیں کرتا

لیلیٰ! یہ جنوں تیری محبت میں لٹایا
ورنہ میں کسی دشت پہ خرچا نہیں کرتا

یہ سچ ہے تعلق وہ پرانا نہیں تجھ سے
بہتان ہے مجھ پر تری پروا نہیں کرتا

کچھ ایسے ہوا ہجر کی لذت سے میں سرشار
تصویر بھی اب اُس کی میں دیکھا نہیں کرتا

میں حلقہ ءِ احباب میں تنہائی کا مارا
بس ایک یہ خامی ہے کہ دھوکا نہیں کرتا

روندوں گا نوید اُسکی محبت میں زمانہ
دریا کبھی بہتے ہوئے سوچا نہیں کرتا

غزل

(احمد فراز کی نذر)

ہر ایک موڑ پہ کہتا ہے دل، کہ یوں بھی نہیں
تو کیا میں اپنی بقا کے لیے چلوں بھی نہیں

نہ جانے لفظ بنایا گیا ہے کیوں مجھ کو
یہ لوگ پڑھ نہیں سکتے مجھے، مِٹوں بھی نہیں

اب اس سکوت میں میرا وجود مل جائے
میں شور ہوں مگر اس شہر میں مچوں بھی نہیں

وہ چاہتا ہے کہ لڑتے ہوئے میں لہروں سے
کنارے تک اُسے لے جاؤں اور بچوں بھی نہیں

ہر اِک چراغ کو اِس آرزو نے خاک کیا
کہ روشنی مری دنیا میں ہو، جلوں بھی نہیں

وگرنہ رک گیا ہوتا یہ ارتقا کا سفر
بناتا رہتا ہوں خود کو مگر بنوں بھی نہیں

میں خود کو کاٹ کے تشکیل کر رہا ہوں تری
وگرنہ زخم جو مجھ کو ملے ہنسوں بھی نہیں

غزل

جیسے مہماں کوئی آئے، کسی مہمان کے بعد
شاعری میں نے بھی کی ہے نئے رجحان کے بعد

اس عنایت پہ میں اظہار کو دوں کونسا رنگ
کشتیاں لے کے چلے آئے ہو طوفان کے بعد

لوٹ آیا ہے وہ لے کر کوئی خالی سا وجود
اور کیا بیچتا بازار میں ایمان کے بعد

میری آنکھوں کے مدینے میں وہی ہے اب تک
تھا جو قرآن سے پہلے، ہے جو قرآن کے بعد

روشنی میں نے یہاں بانٹی چراغوں کے بغیر
زندگی! تو نے بھی دیکھا مجھے تاوان کے بعد

غزل

کب چراغوں سے ہو کے آئی ہے
صبح تو میں نے خود بنائی ہے

میں نے پہلے ہوا کا شور پِیا

روشنی بعد میں اٹھائی ہے

بند ٹی وی پہ سن رہا ہوں میں

جو خبر آنکھ نے چلائی ہے

جس پہ بیٹھا ہوا ہوں برسوں سے

وہ اداسی نہیں چٹائی ہے

گرَد تیرے اداس ہونٹوں نے

پھر مرے کان میں اڑائی ہے

گھر کا دل بیٹھنے لگا سن کر

شکل جو آپ نے مچائی ہے

بات چبھنے لگی تھی دل پہ نویدؔ

جو اُسے خواب میں بتائی ہے

غزل

چھوڑو الجھنا سب سے کنارا کرو "یرا"
دنیا ہے چار دن کی گزارا کرو "یرا"

کہتے ہو کارِ عشق میں کچھ بھی نہیں گراں
مشکل نہیں یہ کام تو سارا کرو "یرا"

چمکے گی تم پہ عالمِ ناسوت کی جبیں
رستہ اب اختیار، ہمارا کرو "یرا"

دریا کا سینہ چاک کروں یا کہ دشت کا
میں ہوں تمہارے ساتھ اشارا کرو "یرا"

ہر ایک موڑ پر نہ تلاشو یوں فائدہ
بازار عشق کا ہے خسارا کرو "یرا"

تم پر تمہارے عکس ابھی تک نہیں کھُلے
اِس آئنے سے بات دوبارا کرو "یرا"

- "یرا" پوٹھوہاری کا لفظ ہے جو دوست وغیرہ کو پکارنے کے لیے مستعمل ہے

غزل

ہر بات پر نہ یوں ہمیں غصہ کریں حضور
کچھ بد مزاج لوگ ہیں دیکھا کریں حضور

اک دن ہوا کے خوف سے کہنے لگا چراغ
میرا یوں شاعری میں نہ چرچا کریں حضور

جتنا جنوں ہے جیب میں باہر نکالیے
بازار ہے یہ عشق کا خرچا کریں حضور

اب سیکھ جائیں آپ ان آنکھوں کی بھی زباں
پلکیں جھکاؤں جب بھی تو سمجھا کریں حضور

اِتنا حسین پھول اور اُس پر یہ برہمی
ہم سے خطا ہوئی ہے تو شکوہ کریں حضور

جھگڑا ہوا ہے آج ستاروں کا چاند سے
بولا ہے کتنی بار، نہ چمکا کریں حضور

غزل

وا عشق کا ہے در، کہ وہ میری نگہ میں ہے
سب کو ہے یہ خبر، کہ وہ میری نگہ میں ہے

دھڑکی نہ زندگی کسی منظر پہ اس سے قبل
اچھا ہے اب سفر، کہ وہ میری نگہ میں ہے

دنیا! یہ خدّ و خال ترے مجھ پہ کیوں کھُلیں
قصہ ہے مختصر، کہ وہ میری نگہ میں ہے

اُس بے وفا کو دشت کا ہے سامنا مگر
اُس کو نہیں ہے ڈر، کہ وہ میری نگہ میں ہے

اُس سے کہو اڑان بھرے آندھیوں میں بھی
کھُولے اب اپنے پر، کہ وہ میری نگہ میں ہے

غزل

مضطرب کیوں ہوں، کہیں مجذوب ہے

میرے اندر دل نہیں مجذوب ہے

ایک میں ہوں، ایک میرا آئنہ

یعنی میرا ہم نشیں مجذوب ہے

گھونسلے محفوظ ہیں اُس پر سبھی

جن درختوں کے قریں مجذوب ہے

یا نظر آتا نہیں انسان کو

یا ستم سہتی زمیں مجذوب ہے

منہدم سارے دِیے جب تھے خموش

روشنی بولی یہیں مجذوب ہے

اک پری وَش جھاڑ دی جب ذہن سے

آ گیا سب کو یقیں، مجذوب ہے

پیار سے رہتے ہیں سارے جانور

یار! جنگل میں کہیں، مجذوب ہے

میں جھلس کر پوچھتا ہوں دشت میں

کیا کوئی مجھ سا حسیں، مجذوب ہے

اِس سخن بازار میں جو شخص بھی

شاعری کرتا نہیں، مجذوب ہے

پاگلوں کے پاس ہیں پتھر نوید

جس کی ہے زخمی جبیں، مجذوب ہے

غزل

ہونٹوں کی کھڑکیوں پہ دلاسا نہیں رہا
یہ عہد میرے ساتھ بھی اچھا نہیں رہا

نمناک تھے درخت پرندوں کو دیکھ کر
رستہ جب ایک گاؤں کا کچا نہیں رہا

یہ روشنی تو میرے کسی کام کی نہیں
گھر کا کوئی چراغ بھی سچا نہیں رہا

میرے قدم بڑھے تو امڈنے لگے سراب
اُس نے نگہ اٹھائی تو صحرا نہیں رہا

اے ہجر! اب گلے سے مجھے بھی اتار دے
دینے کو میری آنکھ میں پرسہ نہیں رہا

جب باپ نے کہا نہ اندھیروں کو دوست رکھ
بیٹے کا تھا جواب، میں بچہ نہیں رہا

بازار اس جہاں کا نوید ایک دن کھُلا
لیکن ہماری جیب میں خرچہ نہیں رہا

غزل

حالات چھڑکتے ہیں نمک اور طرف سے

اے زخم! تو سینے میں دھڑک اور طرف سے

کیوں خواب میں کہتا ہے مجھے روز ستارا

خواہش ہے ضیاء کی تو ہمک اور طرف سے

اِس دل کی حویلی میں بجا ساز انوکھا

بڑھتی ہی گئی کوئی چھنک اور طرف سے

لَو سارے زمانے سے چھپاتا ہے دِیا آج

پھونکی تھی ہواؤں نے جھجک اور طرف سے

اس بار تراشوں کا نئے رستے زمیں پر

پہنچوں گا ترے شہر تلک اور طرف سے

شاعر ہیں سبھی، کون تجھے اپنی جگہ دے

اِس بس پہ مری جان لٹک اور طرف سے

مشکل سے پہنچتے ہیں سبھی لوگ کنوئیں تک

نکلی ہے مرے گاؤں سڑک اور طرف سے

برسوں گا کسی اور ہی ڈھب سے ترے آگے

دھر لوں گا فضاؤں پہ دھنک اور طرف سے

ہے اُس کا مرے ساتھ بہت کڑوا رویّہ

ملتی ہے جسے چائے کڑک اور طرف سے

اس سمت تو کرنوں کا سرکنا نہیں ممکن

اک شخص نے پائی ہے چمک اور طرف سے

کچھ لفظ ٹہلتے تھے کسی اور ورق پر

کانوں سے لپٹتی تھی دھمک اور طرف سے

یہ رنگ کسی اور ہی منظر کا لہو ہے

اے آنکھ! ذرا تو بھی دھڑک اور طرف سے

کیا تیرے گلستاں کے ادھورے ہیں سبھی پھول

کیوں بادِ صبا لائی مہک اور طرف سے

اِس پیڑ کا مٹی سے نہیں کوئی تعلق

ہر شاخ پہ آئی ہے لچک اور طرف سے

نیندوں میں عدو تیرا، تجھے دیکھ کے روئے

خوابوں میں بھی تو جا کے کھٹک اور طرف سے

ہر سمت مرے دوست تھے، ہر سمت مرے یار

درویش یہ بولا کہ، کھسک اور طرف سے

تو موج اگر ہے تو جگا اپنی بغاوت

تو آگ اگر ہے تو بھڑک اور طرف سے

پہلے ہی کہا تھا کہ نگہ ڈھانپ مرے بھائی

برسیں گے کسی موڑ پہ شک اور طرف سے

جیسا ہے جنوں ویسا مجھے بھاتا نہیں ہے

صحرا کو بس اک بار جھٹک اور طرف سے

اُن سارے ستاروں میں نہیں کوئی انوکھا

افلاک پہ تُو جا کے چمک اور طرف سے

چہکا ہے وہاں پنچھی جہاں سوچا نہیں تھا

مانگی تھی بیاباں میں کمک اور طرف سے

حیران ہیں کردار کسی لفظ پہ آ کر

بکھری ہے کہانی میں کسک اور طرف سے

جب حلقہ ءاحباب "کچن "جیسا کہیں ہو

برتن کی طرح تو بھی کھڑک اور طرف سے

آجائے اگر زیست کے ہر موڑ پہ دریا

کچھ رستے دکھاتا ہے فلک اور طرف سے

چہرہ میں نوید اپنا جہاں مرضی بچھاؤں

آئینہ دکھاتا ہے جھلک اور طرف سے

غزل

زماں پتھرا گیا ہے دوڑ جاؤ
اندھیرا چھا گیا ہے دوڑ جاؤ

ندی سے گفتگو تم کر رہے تھے
سمندر آ گیا ہے دوڑ جاؤ

کہاں تم چھوڑ آئے خواب اپنے
زمانہ کھا گیا ہے دوڑ جاؤ

فلک چھونے لگا ہے اب زمیں کو
مگر گھبرا گیا ہے دوڑ جاؤ

یہ رستے زرد ہونے لگ گئے ہیں
تمہارا کیا گیا ہے دوڑ جاؤ

غزل

غزل

جب آرزو کے سب جہان سو گئے
بچھا کے ہم بھی آسمان سو گئے

ہوئیں شجر میں دفن چہچہاہٹیں
جو تھے ہمارے ہم زبان سو گئے

سرہانہ دھر لیا جبیں پہ آج بھی
چھپا کے زخم کے نشان سو گئے

نہ جانے کتنی خواہشوں کو بوَ دیا
پھر اس کے بعد سب کسان سو گئے

خبر نہیں کہ کیا بنے گا حشر میں
ہم اپنا دے کے امتحان سو گئے

غزل

یہ جو تھوڑا سا ہے سامان خوش ہیں
سلامت ہے اگر ایمان خوش ہیں

ابھی مہکے تھے کچھ ہی بول اس کے
صدا آئی کہ سب مہمان خوش ہیں

ہزاروں ہیں سوال اس زندگی پر
جواب اک ہے بہت آسان، خوش ہیں

ذرا میں دیکھ آؤں اس دِیے کو
بجھا کر جس کو سب طوفان خوش ہیں

اکیلا میں نہیں اس کارواں میں
بہت سے اور بھی نادان خوش ہیں

-

غزل

جونہی نگاہ میں ترا چہرہ اُتر گیا
دامن اداس رات کا تاروں سے بھر گیا

اس بھیڑ میں سوال مری زندگی کا تھا
دستار تھامے ہاتھ میں تو بھی گزر گیا

کب خوابِ کارِ عشق میں طے کر سکا کوئی
جتنی مری بساط تھی اُتنا میں کر گیا

اُس نے جلا بجھا کے ستایا ہزار بار
جب بھی چراغ اُسے مری دینے خبر گیا

ترکِ تعلقات کی بابت نوید آج
پوچھا جب آئینے سے تو وہ بھی مکر گیا

غزل

ہوں سفر پر رواں، ہر طرف برف ہے
ہو گی منزل کہاں، ہر طرف برف ہے

مجھ کو مٹی میسر نہیں اس لیے
کیوں بناؤں مکاں، ہر طرف برف ہے

ایک آہٹ نے بہکا دیا ہے مجھے
ہے سنبھلنا گراں، ہر طرف برف ہے

کس کو سونپوں ٹھٹھرتے ہوئے خواب میں
ایک میں ہوں یہاں، ہر طرف برف ہے

سارے رستے پگھلنے لگے ہیں نوید
کب رہیں گے نشاں، ہر طرف برف ہے

غزل

تیرے ہونٹوں پہ ہے انکار کوئی بات نہیں
سن چکا ہوں میں کئی بار کوئی بات نہیں

پہلے بھی صحن میں پڑتی تھیں دراڑیں اکثر
اب مکاں ہو گیا مسمار کوئی بات نہیں

ہجر سے روح پہ پڑتی ہوئی ہر ایک خراش
مجھ سے کہتی ہے عزادار کوئی بات نہیں

بن ترے کوئی تو مل جائے گی منزل مجھ کو
ہاں سفر ہو گیا دشوار کوئی بات نہیں

اِک صدا دی تو زمانے نے مجھے دیکھ لیا
وہ بھی ہو جائے گا بیدار کوئی بات نہیں

میری تنہائی پہ ہنس ہنس کے دِیے سونے لگے
تو بھی بجھ جا دلِ بے زار کوئی بات نہیں

-

غزل

دیکھو کبھی تم اس کا بھی آنا مرے آگے
جس کا نہ چلے کوئی بہانہ مرے آگے

رستہ میں اسے دوں کہ نہیں دوں یہ بتاؤ
سورج مرے پیچھے ہے زمانہ مرے آگے

وہ شخص جسے قیس بتاتے ہیں سبھی لوگ
اب وقت نہیں پھر کبھی لانا مرے آگے

اچھا یہ ستم مجھ کو چراغوں کا لگا ہے
ہر شام ترا عکس سجانا مرے آگے

لاتا ہے مجھے کھینچ کے صحرا ابھی شب و روز
وحشت بھی پروتی ہے فسانہ مرے آگے

--